نظریات

پردے کی مخالفت جن وجوہ سے کی جاتی ہے وہ محض سلبی نوعیت ہی کے نہیں ہیں بلکہ در اصل ایک ثبوتی و ایجابی بنیاد پر قائم ہیں۔ انکی بنا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگ عورتوں کے گھر میں رہنے اور نقاب کے ساتھ باہر نکلنے کو ناروا قید سمجھتے ہیں اور بس اسے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر عورت کے لیے زندگی کا ایک دوسرا نقشہ ہے، تعلقات مرد و زن کے بارے میں وہ اپنا ایک مستقل نظریہ رکھتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں یہ نہ کریں بلکہ کچھ اور کریں، اور پردے پر ان کا اعتراض اس وجہ سے ہے کہ عورت اپنی اس خانہ نشینی اور روپوشی کے ساتھ نہ تو زندگی کا وہ نقشہ جما سکتی ہے، نہ وہ "کچھ اور" کر سکتی ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ "کچھ اور" کیا ہے، اسکی تہ میں کونسے نظریات اور کونسے اصول ہیں، وہ بجائے خود کہاں تک درست اور معقول ہے، اور عملاً اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر انکے نظریات اور اصولوں کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے تب تو پردہ، اور وہ نظام معاشرت جس کا جزو یہ پردہ ہے، واقعی سراسر غلط قرار پائیگا۔ مگر ہم بغیر کسی تنقید اور بغیر کسی عقلی اور تجربی امتحان کے آخر کیوں انکے نظریات تسلیم کر لیں؟ کیا محض جدید ہونا، یا محض یہ واقعہ کہ ایک چیز دنیا میں زور شور سے چل رہی ہے، اس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ آدمی کسی جانچ پڑتال کے بغیر اسکے آگے سپر ڈال ہی دے؟

اٹھارویں صدی کا تصور آزادی جیسا کہ میں اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں، اٹھارویں صدی میں جن فلاسفہ اور علمائے طبیعین اور اہل ادب نے اصلاح کی آواز بلند کی تھی انکو در اصل ایک ایسے نظام تمدن سے

سابقہ درپیش تھا جسمیں طرح طرح کی جکڑ بندیاں تھیں، جو کسی پہلو سے لوچ اور لچک نام کو نہ رکھتا تھا، جو غیر معقول رواجوں، جامد قاعدوں، اور عقل و فطرت کے خلاف صریح تناقضات سے لبریز تھا۔ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اسکو ترقی کے ہر راستہ میں سنگِ گراں بنا دیا تھا۔ ایک طرف نئی عقلی و عملی بیداری طبقۂ متوسط میں اُبھرنے اور ذاتی جدوجہد سے آگے بڑھنے کا پرجوش جذبہ پیدا کر رہی تھی۔ اور دوسری طرف امرا اور پیشوایانِ مذہب کا طبقہ اُنکے اوپر بیٹھا ہوا روایتی قیود کی گرہیں مضبوط کرنے میں لگا ہوا تھا۔ چرچ سے لیکر فوج اور عدالت کے محکموں تک، قصورِ امارت سے لیکر کھیتوں اور مالی لین دین کی کوٹھیوں تک زندگی کا ہر شعبہ اور اجتماعی تنظیمات کا ہر ادارہ اس طرح کام کر رہا تھا کہ محض پہلے سے قائم شدہ حقوق کے زور پر چند مخصوص طبقے ان نئے ابھرنے والے لوگوں کی محنتوں اور قابلیتوں کے ثمرات چھین لے جاتے تھے جو ان طبقوں سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ہر وہ کوشش جو اس صورت حال کی اصلاح کے لیے کی جاتی تھی، برسر اقتدار طبقوں کی خود غرضی و جہالت کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتی تھی۔ ان وجوہ سے اصلاح پسند لوگوں میں روز بروز اندھا انقلابی جوش پیدا ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ بالآخر اس پورے اجتماعی نظام اور اس کے ہر شعبے اور ہر جز کے خلاف بغاوت کا جذبہ پھیل گیا اور شخصی آزادی کا ایک ایسا انتہا پسندانہ نظریہ مقبول عام ہوا جس کا مقصد سوسائیٹی کے مقابلہ میں فرد کو حریت تامہ اور اباحت مطلقہ عطا کر دینا تھا۔ کہا جانے لگا کہ فرد کو پوری خود مختاری کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق ہر وہ کام کرنے کا حق ہونا چاہیے جو اسکو پسند آئے، اور ہر اس کام سے باز رہنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے جو اسے پسند نہ آئے۔ سوسائیٹی کو اسکی انفرادی آزادی چھین لینے کا کوئی حق نہیں۔ حکومت کا فرض صرف یہ ہے کہ افراد کی اس آزادی عمل کو محفوظ رکھے۔ اور اجتماعی ادارات صرف اسلیے ہونے چاہییں کہ فرد کو اس کے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دیں۔

آزادی کا یہ مبالغہ آمیز تصور، جو در اصل ایک ظالمانہ اجتماعی نظام کے خلاف غصہ کا نتیجہ تھا، اپنے اندر ایک بڑے اور عظیم تر فساد کے جراثیم رکھتا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو ابتداءً پیش کیا، وہ خود بھی پوری طرح اسکے

منطقی نتائج سے آگاہ نہ تھے۔ شائد انکی روح کانپ اٹھتی اگر ان کے سامنے وہ نتائج متمثل ہو کر آجاتے جن پر ایسی بے قید اباحت اور ایسی خود سرانہ انفرادیت لازماً منتہی ہونے والی تھی۔ انہوں نے زیادہ تر اُن ناروا سختیوں اور غیر معقول بندشوں کو توڑنے کے لیے اسے بطور ایک آلہ کے استعمال کرنا چاہا تھا جو اُن کے زمانہ کی سوسائیٹی میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن بالآخر اس تصور نے مغربی ذہن میں جڑ پکڑلی اور نشوونما پانا شروع کر دیا۔

انیسویں صدی کے تغیرات فرانس کا انقلاب اسی تصور آزادی کے زیر اثر رونما ہوا[1]۔ اس انقلاب میں بہت سے پرانے اخلاقی نظریات اور تمدنی و مذہبی ضابطوں کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ اور جب ان کا اڑانا ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا تو انقلاب پسند دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر وہ نظریہ اور ہر وہ ضابطۂ عمل جو پہلے سے چلا آرہا ہے، ترقی کی راہ کا روڑا ہے، اُسے ہٹائے بغیر قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ مسیحی اخلاقیات کے غلط اصولوں کو توڑنے کے بعد بہت جلدی انکی مقراض تنقید انسانی اخلاقیات کے اساسی تصورات کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہ عصمت کیا بلا ہے؟ یہ جوانی پر تقویٰ کی مصیبت آخر کیوں ڈالی گئی ہے؟ نکاح کے بغیر اگر کوئی کسی سے محبت کرے تو کیا بگڑ جاتا ہے؟ اور نکاح کے بعد کیا دل آدمی کے سینے سے نکل جاتا ہے کہ اس سے محبت کرنے کا حق چھین لیا جائے؟ اس قسم کے سوالات نئی انقلابی سوسائیٹی میں ہر طرف سے اٹھنے لگے اور خصوصیت کے ساتھ افسانوی گروہ (Romantic School) نے ان کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ اٹھایا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ژورژ سان (George Sand) اس گروہ کی لیڈر تھی۔ اس عورت نے خود اُن تمام اخلاقی اصولوں کو توڑا تھا جن پر ہمیشہ سے انسانی شرافت اور خصوصاً عورت کی عزت کا مدار رہا ہے۔ اس نے ایک شوہر کی بیوی ہوتے ہوئے حصن نکاح سے باہر آزادانہ تعلقات قائم کیے۔ آخر کار شوہر سے مفارقت ہوئی۔ اسکے بعد یہ دوست پر دوست بدلتی چلی گئی اور کسی کے ساتھ برس دوس سے زیادہ نباہ نہ کیا۔ اسکی سوانح حیات میں کم از کم چھ ایسے آدمیوں کے نام ملتے ہیں جنکے

[1] انفرادی آزادی کے اس تخیل سے موجودہ نظام سرمایہ داری (۴۴) جمہوری نظام تمدن، اور اخلاقی آوارگی licentiousness

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۵ پر)

ساتھ اُسکی علانیہ اور باقاعدہ آشنائی رہی ہے - اسکے انہی دوستوں میں سے ایک اسکی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے: "ژورژساں پہلے ایک پروانے کو پکڑتی ہے اور اسے پھولوں کے پنجرے میں قید کرتی ہے — یہ اُسکی محبت کا دور ہوتا ہے - پھر وہ اپنے پن سے اسکو چھوناشروع کرتی ہے اور اسکے پھڑپھڑانے سے لطف اٹھاتی ہے — یہ اُسکی سرد مہری کا دور ہوتا ہے اور دیر یا سویر یہ دور بھی ضرور آتا ہے — پھر وہ اسکے پر نوچ کر اور اسکا تجزیہ کرکے اسے ان پروانوں کے ذخیرے میں شامل کرلیتی ہے جن سے وہ اپنے ناولوں کے لیے ہیرو کا کام لیا کرتی ہے۔" فرانسیسی شاعر اَلفرے مُسے (Alfred Musse) بھی اسکے عُشاق میں سے تھا، اور آخر کار وہ اُسکی بیوفائیوں سے اس قدر دل شکستہ ہوا کہ مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ ژورژساں اسکے جنازے پر نہ آنے پائے - یہ تھا اس عورت کا ذاتی کیرکٹر جو کم و بیش تیس سال تک اپنی شاداب تحریروں سے فرانس کی نوخیز نسلوں پر گہرا اثر ڈالتی رہی - اپنے ناول لیلیا (Lelia) میں وہ لیلیا کی طرف سے استینیو کو لکھتی ہے:

"جس قدر زیادہ مجھے دنیا کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے میں محسوس کرتی جاتی ہوں کہ محبت کے متعلق ہمارے نوجوانوں کے خیالات کتنے غلط ہیں - یہ خیال غلط ہے کہ محبت ایک ہی سے ہونی چاہیے اور اسکا دل پر پورا قبضہ ہونا چاہیے اور وہ ہمیشہ کے لیے ہونی چاہیے - بلاشبہ تمام مختلف خیالات کو گوارا کرنا چاہیے - میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ بعض خاص روحوں کو ازدواجی زندگی میں وفادار رہنے کا حق ہے - مگر اکثریت کچھ دوسری ضروریات اور کچھ دوسری قابلیتیں رکھتی ہے - اس کے لیے ضرورت ہے کہ طرفین ایک دوسرے کو آزادی دیں باہمی رواداری سے کام لیں، اور اُس خودغرضی کو دل سے نکال دیں جسکی وجہ سے رشک و رقابت کے جذبات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴ :- کی تخلیق ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ صدی کے اندر اس نے یورپ اور امریکہ میں اتنے ظلم ڈھائے کہ انسانیت اسکے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوگئی، کیونکہ اس نظام نے فرد کو جماعتی مفاد کے خلاف خودغرضانہ عمل کرنے کا لائسنس دیکر اجتماعی فلاح و بہبود کو ذبح کرڈالا اور جماعتی زندگی کو پارہ پارہ کردیا - سوشلزم اور فاشزم دونوں اسی بغاوت کے مظاہر ہیں، لیکن اس نئی تعمیر میں ابتدا ہی سے ایک خرابی کی صورت مضمر ہے - یہ دراصل ایک انتہا کا علاج دوسری انتہا سے ہے - اٹھارویں صدی کے تصورِ حریتِ شخصی کا قصور یہ تھا کہ وہ جماعت کو فرد پر قربان کرتا تھا - اور اس بیسویں صدی کے تصورِ اجتماع کا قصور یہ ہے کہ یہ فرد کو جماعت پر قربان کرنا چاہتا ہے - فلاحِ انسانیت کے لیے ایک متوازن نظریہ آج بھی ویسا ہی نامعلوم ہے جیسا اٹھارویں صدی میں تھا۔

پیدا ہوتے ہیں۔ ..... تمام محبتیں صحیح ہیں، خواہ وہ تیز و تند ہوں یا پرسکون، شہوانی ہوں یا روحانی، پائدار ہوں یا تغیر پذیر، لوگوں کو خود کشی کی طرف لے جائیں یا لطف و مسرت کی طرف۔"

اپنے ایک دوسرے ناول "ژاک" (Jacques) میں وہ اُس شوہر کا کیرکٹر پیش کرتی ہے جو اسکے نزدیک شوہریت کا بہترین نمونہ ہو سکتا تھا۔ اسکے ہیرو ژاک کی بیوی اپنے آپ کو ایک غیر مرد کی آغوش میں ڈال دیتی ہے۔ مگر فراخ دل شوہر اس سے نفرت نہیں کرتا اور نفرت نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ جو پھول میرے بجائے کسی اور کو خوشبو دینا چاہتا ہے، مجھے کیا حق ہے کہ اسے پاؤں تلے روند ڈالوں۔ آگے چل کر اسی ناول میں وہ ژاک کی زبان سے یہ خیالات ظاہر کراتی ہے:

"میں نے اپنی رائے نہیں بدلی، میں نے سوسائیٹی سے صلح نہیں کی، میری رائے میں نکاح تمام اجتماعی طریقوں میں وہ انتہائی وحشیانہ طریقہ ہے جسکا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر کار یہ طریقہ موقوف ہو جائیگا اگر انسانی نسل نے انصاف اور عقل کی طرف کوئی واقعی ترقی کی۔ پھر اسکی جگہ ایک دوسرا طریقہ لیگا جو نکاح سے کم مقدس نہ ہوگا مگر اس سے زیادہ انسانی طریقہ ہوگا۔ اُس وقت انسانی نسل ایسے مردوں اور ایسی عورتوں سے چلیگی جو کبھی ایک دوسرے کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہ کرینگے فی الحال تو مرد اتنے خود غرض اور عورتیں اتنی بزدل ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی موجودہ قانون سے زیادہ شریفانہ قانون کا مطالبہ نہیں کرتا۔ ہاں! جن میں ضمیر اور نیکی کا فقدان ہے انکو تو بھاری زنجیروں میں جکڑا ہی جانا چاہیے۔"

یہ وہ خیالات ہیں جو ۱۸۳۳ء اور اسکے لگ بھگ زمانہ میں ظاہر کیے گئے تھے۔ ژورژ ساں صرف اسی حد تک جا سکی۔ اس تخیل کو اسکے آخری منطقی نتائج تک پہنچانے کی اکثر بھی ہمت نہ ہوئی۔ بایں ہمہ آزاد خیالی و روشن دماغی، پرانے روایتی اخلاق کی تاریکی پھر بھی کچھ نہ کچھ اسکے دماغ میں موجود تھی۔ اسکے تیس پینتیس سال کے بعد فرانس میں ڈرامانویسوں، ادیبوں اور اخلاقی فلسفیوں کا ایک دوسرا لشکر نمودار ہوا جسکے سرخیل الکساندر دوما

(Alexander Dumas) اور الفرے ناکے (Alfred Naquet) تھے۔ ان لوگوں نے سارا زور اس خیال کی اشاعت پر صرف کیا کہ آزادی اور لطف زندگی بجائے خود انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس حق پر ضوابط اخلاق و تمدن کی جکڑ بندیاں لگانا فرد پر سوسائیٹی کا ظلم ہے۔ اس سے پہلے فرد کے لیے آزادی عمل کا مطالبہ محض محبت کے نام پر کیا جاتا تھا۔ بعد والوں کو یہ بڑی جذباتی بنیاد کمزور محسوس ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے انفرادی خودسری، آوارگی اور بے قید آزادی کو عقل، فلسفہ اور حکمت کی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ نوجوان مرد اور عورتیں جو کچھ بھی کریں قلب و ضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ کریں اور سوسائیٹی صرف یہی نہیں کہ انکی شورش شباب کو دیکھ کر دم نہ مار سکے، بلکہ اخلاقاً جائز و مستحسن سمجھے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں پول اوان (Paul Adam) ہنری بتائی (Henry Bataille) پیر لوئی (Pierre Louys) اور دوسرے بہت سے ادیبوں نے اپنا تمام زور نوجوانوں میں جرأت رندانہ پیدا کرنے پر صرف کیا تاکہ قدیم اخلاقی تصورات کے بچے کھچے اثرات سے جو جھجک اور رکاوٹ طبیعتوں میں باقی ہے وہ نکل جائے۔ چنانچہ پول اوان اپنی کتاب (Le Morale de l'amour) میں نوجوانوں کو انکی اس جہالت و حماقت پر دل کھول کر ملامت کرتا ہے کہ وہ جس (لڑکی یا لڑکے) سے محبت کے تعلقات قائم کرتے ہیں اس کو جھوٹ موٹ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس پر مرمٹے ہیں اور اس سے حقیقی عشق رکھتے ہیں، اور ہمیشہ اسی کے ہو کر رہینگے۔ پھر کہتا ہے:

"یہ سب باتیں اسلیے کی جاتی ہیں کہ جسمانی لذت کی اس صحیح خواہش کو، جو فطری طور پر ہر آدمی میں ہوتی ہے اور جس میں کوئی بات فی الواقع گناہ یا برائی کی نہیں ہے، پرانے خیالات کی بنا پر معیوب سمجھا جاتا ہے اور اسلیے آدمی خواہ مخواہ جھوٹے الفاظ کے پردے میں اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ لاطینی قوموں کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ ان میں محبت کرنے والے جوڑے ایک دوسرے پر اس بات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ ملاقات سے انکا مقصد محض ایک جسمانی خواہش کو پورا کرنا اور لطف اٹھانا ہے۔"

اور اس کے بعد جوانوں کو مشورہ دیتا ہے:

"شائستہ اور معقول انسان بنو۔ اپنی خواہشات اور لذات کے خادموں[1] کو اپنا معبود نہ بنالو۔ نادان ہے وہ جو محبت کا مندر تعمیر کرکے اس میں ایک ہی بت کا پجاری بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ لطف کی ہر گھڑی میں ایک نئے مہمان کا انتخاب کرنا چاہیے۔"

پیر لوئی نے ان سب سے چار قدم آگے بڑھ کر پورے زور کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ اخلاق کی بندشیں دراصل انسانی ذہن اور دماغی قوتوں کے نشوونما میں حائل ہوتی ہیں، جب تک ان کو بالکل توڑ نہ دیا جائے اور انسان پوری آزادی کے ساتھ جسمانی لذات سے متمتع نہ ہو، کوئی عقلی، علمی اور مادی و روحانی ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ اپنی کتاب "افرودیت" (Aphrodite) میں وہ نہایت شدومد کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بابل، اسکندریہ، ایتھنز، روم، وینس اور تمدن و تہذیب کے تمام دوسرے مرکزوں کی بہار اور عروج و شباب کا زمانہ وہ تھا جب وہاں رندی، آوارگی اور نفس پرستی (licentiousness) پورے زور پر تھی، مگر جب وہاں اخلاقی اور قانونی بندشیں انسانی خواہشات پر عائد ہوئیں تو خواہشات کے ساتھ ساتھ آدمی کی روح بھی اپنی بندشوں میں جکڑ گئی!

یہ پیر لوئی وہ شخص ہے جو اپنے عہد میں فرانس کا نامور ادیب، صاحب طرز انشاپرداز، اور ادب کے ایک مستقل اسکول کا رہنما تھا۔ اسکے حلقہ میں افسانہ نگاروں، ڈراما نویسوں اور اخلاقی مسائل پر لکھنے والوں کا ایک لشکر تھا جو اسکے خیالات کو پھیلانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے قلم کی پوری طاقت عریانی اور تعلقات مرد و زن کی بے قیدی کو سراہنے میں صرف کردی۔ اپنی اسی کتاب "افرودیت" میں وہ یونان کے اس دور کی حمد و ثنا کرتا ہے:

---

[1] اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔ ان سے مراد وہ عورتیں یا مرد ہیں جن کو ایک مرد یا عورت اپنی خواہشات نفسانی کی تسکین کے لیے استعمال کرے۔

"جبکہ برہنہ انسانیت ـــــ مکمل ترین صورت جسکا ہم تصور کرسکتے ہیں، اور جس کے متعلق اہل مذہب نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا نے اسے خود اپنی صورت پر پیدا کیا ہے ـــــ ایک مقدس بیسوا کی شکل میں باہزاراں ناز و ادا اپنے آپ کو ۲۰ ہزار زائرین کے سامنے پیش کرسکتی تھی۔ جبکہ کمال درجہ کی شہوانی محبت ـــــ وہی متبرک آسمانی محبت جس سے ہم سب پیدا ہوئے ہیں ـــــ نہ گناہ تھی، نہ شرم کی چیز تھی، نہ گندی اور نجس تھی۔"

حد یہ ہے کہ تمام شاعرانہ پردوں کو ہٹا کر اس نے صاف الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہم کو:

"نہایت پرزور اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے اس مکروہ خیال کا استیصال کر دینا چاہیے کہ عورت کا ماں ہونا کسی حال میں شرمناک، ناجائز، ذلیل اور پایۂ شرف و عزت سے گرا ہوا بھی ہوتا ہے۔"

بیسویں صدی کی ترقیات انیسویں صدی میں خیالات کی ترقی یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نئے شاہباز فضا میں نمودار ہوتے ہیں جو اپنے پیش رووں سے بھی اونچے اڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں پیر وولف (Pierre Wolff) اور گیستاں لیرو (Gaston Leroux) کا ایک ڈراما (Le Lys) نکلا جس میں دو لڑکیاں اپنے جوان بھائی کے سامنے اپنے باپ سے اس مسئلے پر بحث کرتی نظر آتی ہیں کہ انہیں آزادانہ محبت کرنیکا حق ہے، اور یہ کہ "دل لگی" کے بغیر زندگی گزارنا ایک جوان لڑکی کے لیے کس قدر المناک ہوتا ہے۔ ایک صاحبزادی کو بوڑھا باپ اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ وہ ایک نوجوان سے ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ اسکے جواب میں صاحبزادی فرماتی ہیں:—

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، تم نے کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ کسی شخص کو کسی لڑکی سے، خواہ وہ اسکی بہن یا بیٹی ہی کیوں نہ ہو، یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ محبت کیے بغیر بوڑھی ہو جائے۔"

جنگ عظیم نے اس آزادی کی تحریک کو اور زیادہ بڑھایا بلکہ انتہائی مراتب تک پہنچا دیا۔ منع حمل کی تحریک کا اثر سب سے زیادہ فرانس پر ہوا تھا۔ مسلسل چالیس سال سے فرانس کی شرح پیدائش گر رہی تھی۔ فرانس کے

۸۷ اضلاع میں سے صرف ۲۰ اضلاع ایسے تھے جن میں شرح پیدائش شرح اموات سے زیادہ تھی۔ باقی ۶۷ اضلاع میں اموات کی شرح پیدائش کی شرح سے بڑھی ہوئی تھی۔ بعض اقطاع ملک کا حال تو یہ تھا کہ وہاں ہر سو بچوں کی پیدائش کے مقابلہ میں ۱۳۰ - ۱۴۰ - اور ۱۶۰ تک اموات کی تعداد کا اوسط تھا۔ جنگ چھڑی تو عین اس وقت جبکہ فرانسیسی قوم کی موت اور زندگی کا فیصلہ درپیش تھا، فرانس کے مدبروں کو معلوم ہوا کہ قوم کی گود میں لڑنے کے قابل جوان بہت ہی کم ہیں۔ اگر اس وقت ان قلیل التعداد جوانوں کو بھینٹ چڑھا کر قومی زندگی کو محفوظ کر بھی لیا گیا تو دشمن کے دوسرے حملہ میں بچ جانا محال ہوگا۔ اس احساس نے یکایک تمام فرانس میں شرح پیدائش بڑھانے کا جنون پیدا کر دیا اور ہر طرف سے مصنفوں نے، اخبار نویسوں نے، خطیبوں نے اور حد یہ ہے کہ سنجیدہ علماء اور اہل سیاست تک نے ہم زبان ہو کر پکارنا شروع کیا کہ بچے جنو اور جناؤ، نکاح کے رسمی قیود کی کچھ پروا نہ کرو، ہر وہ کنواری لڑکی اور بیوہ، جو وطن کے لیے اپنے رحم کو رضا کارانہ پیش کرتی ہے، ملامت کی نہیں عزت کی مستحق ہے۔ اس زمانہ میں آزادی پسند حضرات کو قدرتی شہ مل گئی تھی، اس لیے انہوں نے وقت کو سازگار دیکھ کر وہ سارے ہی نظریات پھیلا دیے جو شیطان کی زنبیل میں بچے کھچے رہ گئے تھے۔

اس زمانہ کا ایک ممتاز جریدہ نگار جو لالیوں ری پبلکین (Le Lyon Republicain) کا ایڈیٹر تھا اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ "زنا بالجبر آخر کیوں جرم ہے" یوں اظہار خیال کرتا ہے:

"غریب لوگ جب بھوک سے مجبور ہو کر چوری اور لوٹ مار کرنے پر اتر آتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ انکو روٹی مہیا کرو، لوٹ مار آپ سے آپ چھوڑ دینگے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمدردی اور مواساۃ کا جو جذبہ جسم کی ایک طبعی ضرورت کے مقابلہ میں ابھرتا ہے، وہ دوسری ویسی ہی طبعی اور اتنی ہی اہم ضرورت یعنی محبت کے لیے کیوں وسیع نہیں ہوتا۔ جس طرح چوری عموماً بھوک کی شدت کا نتیجہ ہوتی ہے اسی طرح وہ چیز جسکا نتیجہ زنا بالجبر، اور بسا اوقات قتل ہے، اُس ضرورت کے شدید تقاضے سے واقع ہوتی ہے جو بھوک اور

پیاس سے کچھ کم طبیعی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ ایک تندرست آدمی، جو توانا اور جوان ہو اپنی شہوت کو نہیں روک سکتا، جس طرح وہ اپنی بھوک کو اس وعدے پر ملتوی نہیں کر سکتا کہ آئندہ ہفتہ روٹی مل جائیگی۔ ہمارے شہروں میں، جہاں سب کچھ بافراط موجود ہے، ایک جوان آدمی کی شہوانی فاقہ کشی بھی اتنی ہی افسوسناک ہے جتنی کہ ایک مفلس آدمی کی شکمی فاقہ کشی۔ جس طرح بھوکوں کو روٹی مفت تقسیم کی جاتی ہے اسی طرح دوسری قسم کی بھوک سے جو لوگ مر رہے ہیں ان کے لیے بھی ہمیں کوئی انتظام کرنا چاہیے۔"

بس اتنا اور سمجھ لیجیے کہ یہ کوئی مزاحیہ مضمون نہ تھا۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھا گیا اور سنجیدگی ہی کے ساتھ فرانس میں پڑھا بھی گیا۔

اسی دور میں پیرس کی فیکلٹی آف مڈیسن نے ایک فاضل ڈاکٹر کا مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کے لیے پسند کیا اور اپنے سرکاری جریدہ میں اسے شائع کیا جس میں ذیل کے چند فقرے بھی پائے جاتے ہیں:

"ہمیں توقع ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئیگا جب ہم بغیر جھوٹی تعلّی اور بغیر کسی شرم و حیا کے یہ کہدیا کرینگے کہ مجھے بیس سال کی عمر میں آتشک ہوئی تھی جس طرح اب ہم بے تکلف کہدیتے ہیں کہ مجھے خون تھوکنے کی وجہ سے پہاڑ پر بھیجدیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ امراض تو لطفِ زندگی کی قیمت ہیں۔ جس نے اپنی جوانی اس طرح بسر کی کہ ان میں سے کوئی مرض لگنے کی بھی نوبت نہ آئی وہ ایک غیر مکمل وجود ہے۔ اس نے بزدلی، یا سرد مزاجی، یا مذہبی غلط فہمی کی بنا پر اس طبیعی وظیفہ کی انجام دہی سے غفلت برتی جو اس کے فطری وظائف میں سے شائد سب سے اونچا وظیفہ تھا۔"

تو مالتھوسی تحریک کا لٹریچر آگے بڑھنے سے پہلے ایک نظر ان خیالات پر بھی ڈال لیجیے جو منع حمل کی تحریک کے سلسلہ میں پیش کیے گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب انگریز ماہر معاشیات مالتھوس (Malthus) نے آبادی کی روز افزوں ترقی کو روکنے کے لیے ضبط ولادت کی تجویز پیش کی

تھی اُس وقت اسکے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اسکی یہی تجویز ایک صدی بعد زنا اور فواحش کی اشاعت میں سب سے بڑھ کر مددگار ثابت ہوگی۔ اس نے تو آبادی کی افزائش کو روکنے کے لیے ضبط نفس اور بڑی عمر میں نکاح کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے آخر میں جب نو مالتھوسی تحریک (Neo-Malthusian Movement) اٹھی تو اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ نفس کی خواہش کو آزادی کے ساتھ پورا کیا جائے اور اسکے فطری نتیجہ، یعنی اولاد کی پیدائش کو سائنٹفک ذرائع سے روک دیا جائے۔ اس چیز نے بدکاری کے راستے سے وہ آخری رکاوٹ بھی دور کر دی جو آزاد صنفی تعلقات رکھنے میں مانع ہو سکتی تھی، کیونکہ اب ایک عورت بلا اس خوف کے اپنے آپکو ایک مرد کے حوالے کر سکتی ہے کہ اس سے اولاد ہوگی اور اس ذمہ داری کا بوجھ آن پڑیگا۔ اسکے نتائج بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں ہم ان خیالات کے چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں جو برتھ کنٹرول کے لٹریچر میں کثرت کے ساتھ پھیلائے گئے ہیں۔

اس لٹریچر میں نو مالتھوسی مقدمہ عموماً جس طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے:

"ہر انسان کو فطری طور پر تین سب سے زیادہ قاہر اور پرزور حاجتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک غذا کی حاجت، دوسرے آرام کی حاجت، اور تیسری شہوت۔ فطرت نے ان تینوں کو پوری قوت کے ساتھ انسان میں ودیعت کر دیا ہے، اور انکی تسکین میں خاص لذت رکھی ہے تاکہ انسان انکی تسکین کا خواہشمند ہو۔ عقل اور منطق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی انہیں پورا کرنے کی طرف لپکے۔ اور پہلی دو چیزوں کے معاملہ میں اسکا طرزِ عمل بھی یہی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تیسری چیز کے معاملہ میں اسکا طرزِ عمل مختلف ہے۔ اجتماعی اخلاق نے اس پر یہ پابندی لگا دی ہے کہ صنفی خواہش کو حدودِ نکاح سے باہر پورا نہ کیا جائے۔ اور حدودِ نکاح میں زن و شو کے لیے وفاداری اور عصمت مآبی فرض کر دی گئی ہے۔ اور اس پر مزید یہ بھی شرط لگا دی گئی ہے کہ اولاد کی پیدائش کو روکا نہ جائے۔ یہ سب باتیں سراسر لغو ہیں، عقل اور فطرت کے خلاف ہیں، لعین اپنے اصول میں غلط ہیں، اور انسانیت کے لیے بدترین نتائج پیدا کرنے والی ہیں۔" ان مقدمات پر جن خیالات کی عمارت تعمیر ہوتی ہے وہ ملاحظہ ہوں۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر بیبل (Babel) نہایت بے تکلفانہ انداز میں لکھتا ہے:

"عورت اور مرد آخر حیوان ہی تو ہیں۔ کیا حیوانات کے جوڑوں میں نکاح اور وہ بھی دائمی نکاح کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے"؟

ڈاکٹر ڈریسڈیل (Drysdale) لکھتا ہے:

"ہماری تمام خواہشات کی طرح محبت بھی ایک تغیر پذیر چیز ہے۔ اسکو ایک ہی طریقہ کے ساتھ مخصوص کر دینا قوانین فطرت میں ترمیم کرنا ہے۔ نوجوان خصوصیت کے ساتھ اس تغیر کی طرف رغبت رکھتے ہیں، اور انکی یہ رغبت فطرت کے اس عظیم الشان منطقی نظام کے مطابق ہے جسکا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے تجربات میں تنوع ہو۔ ..... آزاد تعلق ایک برتر اخلاق کا مظہر ہے اسلیے کہ وہ قوانین فطرت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، اور اسلیے بھی کہ وہ براہ راست جذبات، احساس اور بے غرض محبت سے ظہور میں آتا ہے۔ جس میلان و رغبت سے یہ تعلق واقع ہوتا ہے وہ بڑی اخلاقی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ یہ بات بھلا اُس تجارتی کاروبار کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے جو نکاح کو درحقیقت پیشہ (Prostitution) بنا دیتا ہے"۔

دیکھیے اب نظریہ بدل رہا ہے بلکہ الٹ رہا ہے۔ پہلے تو یہ کوشش تھی کہ زنا کو اخلاقاً معیوب سمجھنے کا خیال دلوں سے نکل جائے، اور نکاح و سفاح دونوں مساوی الدرجہ ہو جائیں۔ اب آگے قدم بڑھا کر نکاح کو معیوب اور سفاح کو اخلاقی برتری کا مرتبہ دلوایا جا رہا ہے۔

ایک اور موقع پر یہی ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ شادی کے بغیر بھی محبت کو ایک معزز چیز بنا دیا جائے ... ... یہ خوشی کی بات ہے کہ طلاق کی آسانی اس نکاح کے طریقہ کو آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہے کیونکہ اب نکاح بس دو اشخاص کے درمیان مل کر زندگی بسر کرنے کا ایسا معاہدہ ہے جسکو فریقین جب چاہیں ختم

کر سکتے ہیں۔ یہ صنفی ارتباط کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے۔"

فرانس کا مشہور نومالتھوسی لیڈر پول روبین (Paul Robin) لکھتا ہے:

"پچھلے ۲۵ سال میں ہم کو اتنی کامیابی تو ہو چکی ہے کہ حرامی بچہ کو قریب قریب حلالی بچہ کا ہم مرتبہ کر دیا گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے۔"

انگلستان کا مشہور فلسفی مِل اپنی کتاب "آزادی" (On Liberty) میں اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ ایسے لوگوں کو شادی کرنے سے قانوناً روک دیا جائے جو اس بات کا ثبوت نہ دے سکیں کہ وہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ذرائع رکھتے ہیں۔ لیکن جس وقت انگلستان میں قحبہ گری (Prostitution) کی روک تھام کا سوال اٹھا تو اسی فاضل فلسفی نے بڑی سختی کے ساتھ اسکی مخالفت کی۔ دلیل یہ تھی کہ یہ شخصی آزادی پر حملہ ہے اور ورکرز کی توہین ہے، کیونکہ یہ تو انکے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرنا ہوا!

غور کیجیے، شخصی آزادی کا احترام صرف اسلیے ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر زنا کی جائے۔ لیکن اگر کوئی احمق اسی شخصی آزادی سے فائدہ اٹھا کر نکاح کرتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسکی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔ اسکی آزادی میں تو قانون کی مداخلت نہ صرف گوارا کی جائیگی بلکہ آزادی پسند فلسفی کا ضمیر اسکو عین مطلوب قرار دیگا! یہاں اخلاقی نظریہ کا انقلاب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جو عیب تھا وہ صواب ہو گیا۔ جو صواب تھا وہ عیب ہو گیا۔